اسلامی نظامِ تعلیم کے تقاضے

اور

دینی مدارس

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی



مکتبہ جمالِ کرم لاہور

سلامی نظامِ تعلیم کے تقاضے اور دینی مدارس

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی



مکتبہ جمالِ کرم
۹۔ مرکز الاویس (دستا ہوٹل) دربار مارکیٹ ○ لاہور
042-7324948,0321-4300441

نام کتاب	اسلامی نظامِ تعلیم کے تقاضے اور دینی مدارس
مولف	پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
تعداد	گیارہ سو
سن اشاعت	مارچ 2006ء
صفحات	32
زیر اہتمام	ایم احسان الحق صدیقی
ناشر	مکتبہ جمال کرم لاہور
قیمت	15 روپے

ملنے کا پتہ



مکتبہ جمالِ کرم

۹۔ مرکز الاویس (استانہ ہوٹل) دربار مارکیٹ ○ لاہور

042-7324948,0321-4300441

اسلامی نظام تعلیم کے تقاضے اور دینی مدارس

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ ۲۴ھ کے قریب شرع ہوا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ مسلمان تاجروں اور مہاجر علماء کے اخلاق و سیرت نے مقامی آبادی کو متاثر کیا، ۹۲ھ کے آخری ایام میں جب محمد بن قاسم ساحل دیبل پر مسلمان سلطنت کی ابتدائی حکایت رقم کر رہا تھا تو غیر مسلم مقامی آبادی کا ردعمل معاندانہ نہ تھا بلکہ زیادہ تر ہمدردانہ تھا ۹۲ھ سے ۱۲۷۵ھ تک تقریباً بارہ سو سال مسلمان برصغیر کی نمایاں سیاسی قوت رہے، اس لئے ان کی تہذیب کے چرچے ہوئے اور ان کا تمدن مستحکم ہوا، اس طرح برصغیر کو اسلامی تشخص کا حوالہ ملا، سلاطین کی ابتدائی کامیابیاں مسلم معاشرت کی ترسیخ کا باعث بنیں مغلیہ دور حکومت اپنے مرتبے اور جلال کے سبب پوری دنیا کے لئے مرکز نگاہ بناء ایک مستحکم حکومت جس کے بارے میں شعوری نہ سہی لاشعوری طور پر فیصلہ کر لیا گیا کہ تخت کی زینت بننے کے لئے کسی مغل شہزادے کی ضرورت ہے اگرچہ وہ شیر خوار ہی ہو، عباسیوں کے بعد یہ سطوت

مغلیہ کو حاصل رہی یہ بجا کہ برصغیر کی تاریخ میں مغلیہ دور کی نمایاں حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس تاریخی حقیقت کو بھی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اقتدار کی سرمتی سے جو بے ضابطگیاں کی گئیں انہی کی کوکھ سے مسلم حکومت کے زوال کے سوتے پھوٹے، یہ ضرور خیال رہے کہ مغلیہ اقتدار اسلامی اقتدار نہ تھا کہ اشاعت اسلام اور تنفیذ احکام کی کوئی باضطہ کوشش نہ ہوئی تھی، اگر اسلام کی ترویج ممکن رہی تو وہ علماء حق اور صوفیاء برحق کا فیضان تھا، اورنگ زیب عالمگیر جسے علامہ اقبال نے مسلمان امت کے ترکش کا آخری تیر قرار دیا تھا اور جسے بت خانہ ہند میں اسوۂ ابراہیمی کا علمبردار گردانا تھا۔ اقتدار کے نشہ میں پھوٹنے والی بداعمالیوں کے مداوا کے لئے کوشاں تو رہا مگر بے راہ روی کا صدیوں پر پھیلا ہوا تعفن دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، عالمگیر کے بعد تو باہمی رقابتوں کا طوفاں اٹھا جس سے ملی تشخص کو مزید نقصان پہنچا، تخت دہلی جو کبھی سطوت کا نشان تھا مرگ انبوہ کا جشن بن گیا، تخت نشینی کی جنگ خود حصاری کی اسیر ہوگئی، ایسے حالات میں عوام کے درد کا درماں کون بنتا جس سے حکومت اور رعایا میں لاتعلقی کا وبعد بڑھتا گیا، یہ وہ صورت ہوتی ہے جب قوموں کا زوال شب خون مارتا ہے، فرشتہ اجل نے دہلی کے گردونواح ہی میں مسکن بنا لیا تھا، بے ہمتی سے موت آئے یا خنجر انتقام سے، موت بہرحال حکمرانوں کا مقدر بن چکی تھی۔ ان حالات میں سمندر پار سے آنے والے سفید فام انگریز تاجروں نے ساری منڈی بے مول ہتھیالی، مسلم ریاستیں جو ذاتی تحفظ کے ارمان پال رہی تھیں۔ سپر انداز ہوتی گئیں اس طرح غیر ملکی اجنبی حکمرانی کی راہ ہموار ہوئی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی زوال آشنا قوم کا آخری ردعمل تھا جو رقص بسمل کی طرح بے توفیق ہوتا گیا۔ آزادی کی جنگ بوجوہ ناکام

ہوئی، انفرادی کاوشیں ضرور ہوئیں اور کئی نام ہمیشہ کے لئے صف شہداء میں شامل ہو کر بقائے دوام پا گئے مگر قوت کے مراکز بے نصیب نکلے کوئی چنگاری نہ پھوٹی اور کوئی مفتوحانہ ردعمل بھی سامنے نہ آیا، جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد تو میدان انگریزوں کے ہاتھ میں تھا وہ برصغیر پر حکومت حاصل کر چکے تھے مگر عقل عیّار نے حکومت کے مراکز پر قبضے کو ہی کافی نہ سمجھا انہوں نے اذھان بلکہ ایمان پر قبضہ کو بھی اپنا حق سمجھا، اسی لئے کہ وہ جانتے تھے اذھان کی تسخیر نہ ہو تو سیاسی فتح دیرپا نہیں ہوتی اس لئے انگریزی سیاست کا مرکزی مسلمانوں کی سطوت کے تمام آثار مٹانا اور ان کے اندر کے جذبوں کو پامال کرنا تھا تا کہ ہمہ جہتی زوال مسلمانوں کا مقدر بنے، مسلمان مضطرب تھے کہ سیاست سے مذہب تک اور معاشرت سے معیشت تک غلامی کا حصار تنگ کیا جا رہا تھا۔ وہ چیخے ضرور مگر

ملت کی چیخ شعبدہ بازوں کا راگ تھا

انگریز کی نظر اسلامی علوم کے ان مراکز پر تھی جن سے مسلم قوم کا تشخص قائم تھا، ان کی خواہش تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ان سرچشموں کو بے توفیق بنا دیا جائے، ایسے ماحول میں انحطاط پذیر قوم کو عزم نو عطا کرنا ناممکن ہو رہا تھا بقول سید لطفی المفقلوطی کنویں کے کنارے سے پھسلے ہوئے قدم تہہ تک پہنچے بغیر قرار نہیں پکڑتے اور مسلمان تو پھسلے ہی نہ تھے قعر گمنامی میں پھینکے جا رہے تھے، ایسے گھمبیر حالات میں قدرت نے علماء امت کو بیدار کیا، انہیں نامساعد حالات میں مسلم امت کی راہنمائی کا فریضہ سونپا اس لئے کہ یہ وہ بیدار مغز لوگ تھے، جو تاریک افق کے دبیز پردوں کے پیچھے سے طلوع ہونے والے سورج کی ضیا پاشیوں کو اسیر کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔

عہد زوال میں ایسے دردمند اکابر نے صیانت دین اور تحفظ ثقافت اسلامیہ کا بیڑا اٹھایا، انگریز حکومت ان برسر جہاد قوتوں سے بے خبر نہ تھی بلکہ وہ پوری قوت و طاقت کے ساتھ ان اداروں کے اثر کو زائل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہی، ان اداروں کے گرد معاشی حصار قائم کیا گیا تا کہ یہ ادارے فقر واحتیاج کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جائیں، ان اداروں کی افادیت زائل کرنے کے لئے ایک نیا نظام تعلیم رائج کیا گیا جو بظاہر ترویج علم کے لئے قائم کیا گیا تھا مگر بباطن غلاموں کو غلامی کا خوگر بنانے کا سامان تھا۔

قیام پاکستان یعنی وطن عزیز میں صبح آزادی کی نور افشانی کے وقت ہمارا نظام تعلیم تثلیث کا شکار تھا یعنی

(۱) سرکاری تعلیمی ادارے جہاں نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس کو حکمرانوں کی خواہشات کے مطابق ڈھالا گیا تھا تا کہ ایک ایسا گروہ وجود میں آئے جو اپنی توانائیوں کو صاحب بہادر کی رضا طلبی میں بروئے کار لانے کا سلیقہ رکھتا ہو۔

(۲) مقامی یا پرائیوٹ ادارے جن کی پیشانی پر ایسا دلکش لاحقہ خبر و اسم بن کر رقم تھا جس سے قومی حس کو تو تسکین حاصل ہو مگر عملاً وہ بھی سرکاری اداروں کے ساتھ اسی مشن کی تکمیل کے لئے کوشاں تھے جس کے لئے سرکاری تعلیمی ادارے قائم کئے گئے تھے۔

(۳) دینی تعلیمی ادارے جن کا مقصد تحفظ ماسلف تھا تا کہ قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے استوار رہے یہ ادارے دراصل وہ پناہ گاہیں تھیں جہاں مستقبل کے نامساعد حالات کے لئے ماضی کی تابنا کیوں کو محفوظ کیا جا رہا تھا۔

پاکستان ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا، وقت کا تقاضا تھا

کہ اس تدریسی تثلیث کا مداوا کیا جاتا اور وحدت قومی کے لئے مشترک تگ و دو کی جاتی مگر بدقسمتی سے قومی مفاد کا یہ فیصلہ بے یقینی کا شکار رہا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ ہم نے ایک نظریاتی ریاست کے تقاضوں کو جاننے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنے بعض روّیوں سے وطن عزیز کی نظریاتی حیثیت کو مجروح کرنے کا سامان کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام تعلیم کا قبلہ درست نہ ہو سکا اور ہم تاریک راہوں کے مسافر رہے، یہ تمام ادارے معائد روشوں پر چلتے رہے اور نظریاتی تصادم پیدا ہونے لگا، درمیانی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی اور ایک ادارے کے طالب علم دوسرے ادارے کے طلبہ پر کبھی بے دینی، بے راہ روی اور مادہ پرستی کے الزام لگاتے رہے اور کبھی بے علمی، دقیانوسی اور تنگ نظری کی پھبتیاں کستے رہے، اس طرح پاکستان میں بسنے والی مسلمان ملت باہمی افتراق کا شکار ہو گئی پھر جب قومیانے کے عمل کے نتیجہ میں سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ایک ضابطے کے تحت اکٹھے کر دیئے گئے، مقاصد تو پہلے ہی ایک تھے مگر اب انتظامی ڈھانچہ بھی ایک ہو گیا تو تعلیمی عمل تثلیثی حصار سے نکل کر ثنویت کا شکار ہو گیا اور دو واضح متوازی دھارے وجود میں آئے، سرکاری ادارے اسی نظم تعلیم کے مطابق رہے جو انگریز حکومت نے متعین کر دیئے، انہی اداروں سے فارغ ہونے والے طلبہ حکومتی مناصب کے اہل قرار پائے اور دینی مدارس کی جولاں گاہ اور محدود ہو گئی ایک کوشش ہوئی کہ دینی مدارس کے طلبہ کو معاشرتی رفعت عطا ہو، اسناد کو جو الشہادۃ العالمیہ کی حامل تھیں صرف تدریس کی حد تک ایم۔ اے عربی اور ایم۔ اے اسلامیات کے مطابق قرار دیا گیا اور عربی زبان کو چھٹی جماعت سے لازمی کر دیا گیا، یہ ایک مثبت قدم تھا مگر اس کے اطلاق میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کی سعی نہ ہو سکی، ایم۔ اے

کے نیچے درجات کی مساوات کیسے قائم ہوگی اس پر توجہ نہ دی گئی جس سے کئی انتظامی الجھنوں نے جنم لیا۔ دینی مدارس کا طالب علم پی۔ایچ۔ڈی کی تحقیقی پیش رفت میں تو شریک ہوگیا مگر حکومتی مناصب میں ایک معمولی منصب کا بھی اہل نہ ہوا، اس سے بے یقینی پھیلی، اسی بے یقینی سے بعض مفاد پرستوں نے فائدہ اٹھایا، اس صورت حال کا نقصان یہ ہوا کہ باہمی کشاکش شروع ہوگئی اور متعدد بدنما صورتیں سامنے آئیں، مغربی تعلیم کو حرف آخر گردانے والوں نے دینی مدارس کا ایسا خوفناک نقشہ عوام کے سامنے رکھا کہ کئی اصحاب اس سے متاثر ہو گئے، تصادم کا خطرہ ابھرا، باہمی عناد نے جنم لیا، اس میں بعض حریفانہ نقطہ نظر والوں نے دینی مدارس کی مخالفت کی پناہ میں دین کو ہی ہدف تنقید بنایا اور کئی بزعم خویش مفکرین کو اپنا قدیمی بغض نکالنے کا موقعہ ملا۔

اس تناظر میں دینی مدارس کا اپنا کردار بھی پیش نظر رہنا چاہئے، قیام پاکستان سے پہلے یہ عافیت کے حصار حکومت وقت کی دستبرد سے بچنے کے لئے اپنا کردار انجام دے رہے تھے کہ غیر قابض تھے، ان غیروں سے نجات کے لئے دین کے طلبہ نے بھرپور کردار انجام دیا تھا اگر چند علماء کے ذہنی تحفظات تھے اس لئے مخالفت بھی ہوئی مگر مغرب پسند طبقہ نے کمال عیاری سے بعض سادہ لوح افراد کو ورغلا لیا کہ دینی طبقہ تو پاکستان کے قیام کا مخالف تھا، کانگرسی ہونے کی پھبتی جو چند افراد پر تو لگائی جا سکتی تھی اور اس میں جدید طبقہ بھی شامل تھا آخر یونینیسٹ کون تھے، کیا یہ علماء کے نمائندے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ الزام لگتا رہا اور دینی طبقہ دفاعی لائن پر کھڑا ہوگیا، حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ خانقاہوں، زاویوں اور دینی مدارس کے حصار میں پرورش پانے والے طلبہ کو قومی جدوجہد کا فعال حصہ بنا دیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا تحریک پاکستان

کے ہراول دستہ کے دینی علوم کے شناور اور خانقاہوں یا زاویوں میں تربیت قوم کے فریضہ کو نبھانے والے افراد نے دور غلامی کی طرح کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا اور وہ دین جس کے نام پر ملک حاصل کیا گیا تھا، معاشی جبر کا نتیجہ قرار دے دیا گیا اور دینی تعلیم اسی طرح ثانوی ہوگئی جیسے پہلے تھی، عمارت کی تعمیر میں خون پسینہ بہانے والے افراد اگر عمارت کے مستقبل کو اپنے ہاتھوں میں نہ لیں گے تو وہی ہوگا جو وطن عزیز میں ہوا۔ دینی مدارس جو پہلے ہی ایک گھٹن کا شکار تھے مزید دھکیلے گئے یہاں تک دیوار سے جا لگے۔

یہ ہے وہ فضا جو وطن عزیز کو محیط ہے، پاکستانی ملت کو پورے خلوص اور لگن سے اپنا راستہ متعین کرنا ہے۔ یہ راستہ حالات کے جبر کے تحت نہیں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے تحت اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے، بہتر ہوگا کہ اصلاحی کاوشوں کے ذکر سے پہلے اسلامی تعلیمات پر نظر ڈال لی جائے جو علم و تعلیم کے حوالے سے ہمارے لئے راہنمائی کا ذریعہ ہیں، یہ اسی لئے ضروری ہے کہ مزید وقت ضائع نہ ہو اور درست سمت میں پیش رفت ہو سکے۔ اس سلسلے میں چند گذارشات لائق توجہ ہیں۔

ہر قوم اور ہر معاشرے کا اپنا مخصوص نظریہ حیات ہوتا ہے جو اُسے دیگر اقوام سے ممتاز کرتا ہے اسی مناسبت سے ہر قوم کا اپنا نظریۂ تعلیم ہوتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ مختلف الخیال اور متضاد نظریات کی حامل اقوام ایک جیسے نظریۂ تعلیم کو اپنا سکیں، یہ بجا کہ بعض مبادی مباحث ایک جیسے ہو سکتے ہیں مگر اس کے باوجود امتیازی نشانات بہر کیف باقی رہتے ہیں، یہ بھی یاد رہے کہ ہر قوم و ملت کو زندہ رہنے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کیلئے اپنے نظریۂ حیات کے مطابق نظریۂ تعلیم مرتب کرنا ہوتا ہے کیونکہ

نظریۂ تعلیم کا بنیادی مقصد نظریۂ حیات کی محبت کا فروغ ہے، یہ حقیقت ہے کہ جب تک اپنے نظریۂ حیات پر کامل اعتماد نہ ہوگا منفی رجحانات حملے کرتے رہیں گے اور جب تک نظریۂ حیات کی تعلیم کے لئے مناسب اور مربوط نظام تعلیم قائم نہ ہوگا لغزش قدم کا خطرہ باقی رہے گا، انسانی فطرت کا اقتضاء ہے کہ جب تک اسے تسکین حاصل نہ ہو وہ پا در ہوا رہتی ہے، ایک بھوکا انسان جس کی اشتہاء کی تسکین کے لئے مناسب غذا موجود نہ ہو، ہر قسم کی غذا کی خواہش کرے گا تا کہ پیٹ بھر سکے، اسی طرح جب کسی انسان کے دل و دماغ کو اپنے نظریہ حیات سے سکون نصیب نہ ہو وہ غیر نظریات کو اپنانے کی خواہش کرے گا تا کہ اپنے ذہنی خلا کو پر کر سکے، یہ مرحلہ بڑا نازک ہوتا ہے، ایک مربوط اور ہمہ جہت نظام تعلیم کے بغیر اس ذہنی آوارگی اور قلبی پراگندگی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کے برپا کیے ہوئے نظام تعلیم کے خدوخال کی وضاحت سے قبل یہ فیصلہ کر لینا ضروری ہے کہ اس نظام تعلیم میں علم کی عمومی حیثیت کیا ہوگی۔

علم کا حصول اک عمدہ مقصد ہے، ہر قوم و ملّت میں علم و آگہی کو شرف حاصل رہا ہے، اسلامی تعلیمات اس حوالے سے بڑی واضح ہیں کہ ان میں نظام تعلیم کی ساری عمارت اس یقین پر رکھی جاتی ہے کہ علم فرض ہے، علم کی اختیاری و امتیازی حیثیت کو تقریباً ہر قوم نے تسلیم کیا ہے مگر اسلام کے ہاں یہ مسئلہ اختیاری یا امتیازی نہیں لازمی ہے علم کا حصول مسلم معاشرہ میں ہر مرد اور عورت پر فرض ہے، ارشاد باری ہے

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (الانبیاء:۷)

”اگر تم جانتے نہیں ہو تو اہل ذکر سے دریافت کرو“

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ

(سنن ابن ماجة باب فضل العطام والحث علی طلب العلم)

یعنی علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے، علم اور حاملین علم کی عظمت کے اظہار میں قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر: ۹)

"فرما دیجئے: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہوتے ہیں۔"

تخلیق انسانی کے ساتھ علم کے گہرے ربط کا ذکر فرمایا گیا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (الرحمن: ۴)

"خالق کائنات نے انسان کو پیدا فرمایا اور اسے بیان کی تعلیم دی"

ان ارشادات سے عیاں ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق علم کا حصول افراد کا ذوقی مسئلہ نہیں بلکہ یہ تو ایسا فرض ہے جو سب پر لازم ہے، عظمت و بزرگی بلکہ بحیثیت انسان شناخت کا حوالہ علم ہے اس لئے اسے محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ انسانی معاشرے پر واجب ہے کہ علم کا نور سب کو مستفید کرے۔

علم کی فرضیت کے ساتھ دوسرا مرحلہ تعلیم کی فرضیت کا ہے، اگر علم حاصل کرنا فرض ہے تو حاصل کردہ علم کو دوسروں تک پہنچانا بھی فرض ہے، یہ صرف ملازم استاد کی ہی ذمہ داری نہیں، ہر ہر فرد معاشرہ کی ذمہ داری ہے، اس ابلاغ علم کا وعدہ یوم میثاق ہی لے لیا گیا تھا:

وَاِذْ اَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ

وَلَاتَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران:۱۸۷)

''اور جب اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا جنہیں کتاب عطا کی گئی کہ تم ضرور اس کو لوگوں کے لئے واضح کرنا اور اسے نہ چھپانا''

علم ایک بہتا ہوا دریا ہے جس کے آگے بند باندھنا اسلام کے نزدیک ایک غیر انسانی حرکت ہے، متعدد آیات واحادیث میں اس ایصال علم کا ذکر ہوا اور تعلیم کی اہمیت وحیثیت کا ذکر ہوا مثلاً

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ

(سنن ابن ماجة باب فضل من تعلم القران و علّمه)

''تم میں سے وہ انسان بہتر ہے جو قرآن سیکھے اور اس کی تعلیم دے'' یا یہ کہ

اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ اَنْ يَتَعَلَّمَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ عِلْمًا ثُمَّ يُعَلِّمَهٗ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ

(سنن ابن ماجة باب ثواب معلم الناس الخير)

''افضل صدقہ یہ ہے کہ مسلمان علم سیکھے اور پھر وہ اپنے مسلمان بھائی کو یہ علم سکھائے''۔

بعض روایات میں کتمان علم پر وعید کا رنگ نمایاں ہے مثلاً ارشاد نبوی ہے:

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهٗ فَكَتَمَهٗ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِالِجَامٍ مِنْ نَّارٍ

(سنن ابن ماجه باب مسئل عن علم فكتمه)

''جس سے کسی علم کا پوچھا گیا جو وہ جانتا تھا اور اس نے چھپالیا قیامت کے روز اس کو آگ کی لگام ڈال دی جائے گی۔''

ان روایات وارشادات سے ثابت ہوا کہ اسلامی نظام تعلیم میں علم کی طلب کوئی طبقاتی رعائت نہیں اور نہ ہی یہ چند افراد کے لئے عظمت وجلال کا زینہ ہے بلکہ یہ تو پورے معاشرہ کا مشترک وصف ہے، علم ایک مسلسل عمل ہے جسے نسل در نسل منتقل ہوتے رہنا ہے، یہ امانت ہے کہ اس کا روک لینا بدترین خیانت ہے، ان ہدایات کی روشنی میں اپنے اساسی لزوم کے حوالے سے جلب زر کا ذریعہ نہیں بنیادی انسانی فریضہ ہے یہ پیغمبرانہ منصب ہے کہ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد تعلیم امت ہی ہے، حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد کو چار شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی تلاوت آیات، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت، ان چار لزومی عناصر سے ہی اسلامی نظام تعلیم کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ نے اپنا تعارف ایک معلم کی حیثیت سے ہی کرایا، فرمایا۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

(سنن ابن ماجة باب فضل العلماء والحث علی طلب علم

بیشک ''میں معلم بن کر ہی مبعوث کیا گیا ہوں''

اس سے ظاہر ہوا کہ اسلامی نظام تعلیم کو ترتیب دینے والی شخصیت ایک معلم کی ہے، حالانکہ تجربہ یہ ہے کہ اکثر نظام ہائے تعلیم ''انتظامیہ'' کی سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس کے نفاذ کی ذمہ داری ان افراد کو سونپی جاتی ہے جن کا اس نظام کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا، اسلام کا نظام تعلیم ایک معلم کا وضع کردہ ہے، جسے واضع نے وضع بھی کیا اور اس کا عملی نفاذ بھی فرمایا اس لئے اس نظام میں تھیوری اور پریکٹس کی وہ ثنویت نہیں ہے جو دیگر نظاموں کا ایک بنیادی نقص ہے، حضور اکرم ﷺ نے تعلیم کا مربوط ڈھانچہ فراہم فرمایا۔ خود عملی نفاذ فرمایا اور ایک پریکٹسنگ معلم کی حیثیت سے اس پر عمل بھی کرایا۔

اسلامی نظام تعلیم میں علم کی فرضیت، تعلیم کی ضرورت، نصاب کی تدوین و ترتیب اور معلّم کی حیثیت واہمیت کا تعین تعلیمات اسلام کو اساس بنا کر کیا جاتا ہے تا کہ حق کی سطوت قائم رہے، علم وآ گہی کی عظمت کا احساس باقی رہے اور عدل وانصاف کو فروغ حاصل رہے، ان مقاصد کا حصول، نظام تعلیم کی مربوط اور درست تدوین کے بغیر ممکن نہیں، تعلیم چہار پہلو اساس پر قائم ہے اور یہ چاروں اساسی پہلو ایک دوسرے میں پیوں پوست ہیں کہ کسی ایک کو نظر انداز یا مناسب اہمیت نہ دینا پورے نظام کو بے توفیق بنا دیتا ہے، یہ چار بنیادیں، مقصد تعلیم، مادۂ تعلیم معلم و متعلم ہیں۔

تعلیم بذات خود نہ اچھی کہی جاسکتی ہے نہ بری کیونکہ یہ تو نظریات حیات کی خادم ہے، اگر نظریہ حیات مستحکم، مربوط اور منضبط ہوگا تو تعلیم اچھے نتائج پیدا کرے گی اور مستحسن قرار پائے گی اور جب محرک نظریہ ہی باطل ہوگا تو نتائج غیر مستحسن ہو نگے اور تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ بدنام ہوگا، تعلیم کی خوبی یا خامی دراصل اس نظریہ کے حوالے سے دیکھی جاتی ہے جس کی اشاعت وترویج کی یہ ذمہ داری قبول کرتی ہے، مقصد تعلیم میں نظریات کا متوازن مقام ومرتبہ ہی تعلیم کی افادیت کو اجاگر کرتا ہے، اسلام، قابل حصول علم اور ناقابل حصول علم کے درمیان ایک اعتدال پسند روّیے کا داعی ہے، اسلام نے مقصد علم میں جس عدل کو قوت حاکم کے طور پر تسلیم کیا ہے اسی کی طرف واضح اشارات نبی مکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں موجود ہیں، یہ دعا کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ:۱۱۴) یعنی اے میرے پروردگار میرے علم کو زیادہ تر فرما، علم کی اہمیت اور حصول علم کی ضرورت کا بڑا قوی پیغام ہے، ازدیاد علم کی اس دعا کے ساتھ یہ دعا بھی نبی اکرم ﷺ کی دعاؤں کا حصہ رہی ہے۔ التجا کی گئی کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِن عِلْمٍ لَایَنْفَعُ (سنن ابن ماجہ ابواب الدعا)

''یعنی اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع بخش نہیں ہے'' اس ارشاد پاک سے علم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا علم نافع اور علم غیر نافع، علم نافع وہ ہے جو مقصد حیات کے حصول میں معاون بنے اور اس سے اپنے نظریہ حیات کی محبت فزوں تر ہو، سمجھا دیا گیا کہ انسانی رویے علم کو نافع یا غیر نافع بناتے ہیں علم کی ایک شاخ بعض کے حق میں نافع جبکہ دوسروں کے حوالے سے غیر نافع ہو سکتی ہے مثلاً علم طب، انسانیت کے درد کی درمانی کے لئے حاصل کیا جائے تو نافع اور اگر مجبور افراد کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے اور خواہش زر کے لئے ہو تو غیر نافع اور لائق مذمت، اس لئے معیار ''مقصد علم'' ہے، دیکھنا ہو گا کہ نظام تعلیم میں مقصد علم کی وضاحت کیسے کی گئی ہے؟ اور کہاں تک طلبہ کے روّیوں میں اسی مقصد کی عظمت آشکار ہوئی ہے، طلبہ کا مستقبل کا کردار ''نظام تعلیم'' کی افادیت یا مضرت کا درست پیمانہ ہو گا، اس حوالے سے ایک نظر مکتب رسالت کے زیور علم سے آراستہ طلبہ پر ڈالیں اور پھر دیگر نظام ہائے تعلیم کے تحت فارغ ہونے والے طلبہ کے کردار و سیرت کا جائزہ لیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ مقاصد تعلیم کا واضح تعین اور علوم کی بوقلمونی سے عادلانہ اخذ و ترک کس قدر ضروری ہے اور کیسے اثرات کا حامل ہے۔

اسلامی نظام تعلیم میں ''مادۂ تعلیم'' نہ یک رنگی کی یبوست کا شکار ہے اور نہ بوقلمونی کے انتشار کا نخچیر، تعلیم ایک مسلسل عمل ہے کہ یہ مہد سے لحد تک ایک مربوط سلسلہ ہے، اسی میں تدریج کا فطری عمل جاری رہتا ہے، مادۂ تعلیم کا دائرہ انسان کے اپنے وجود سے کائنات کے ذرے ذرے تک کو محیط ہے، انفس و آفاق پر غور و تدبر کی

تحریک بھی ہے اور پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی آبیاری کا اہتمام بھی، اخلاقی و کرداری پہلو جو جوہرِ انسانیت کی تابناکی کا ذریعہ ہیں کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ مگر ان کے ساتھ مادی و طبیعاتی شعبہ ہائے علم کو واضح اہمیت دی گئی ہے، قوموں کی امامت اور شخصی بالیدگی کے لئے روحانی جلا کے ساتھ صحت مندانہ نشو و نما کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہوا کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرۃ: ۲۴۷) یعنی جناب طالوت کو حکومت و اقتدار کا اعلیٰ منصب ان کی علم میں برتری اور جسمانی قوت کی افزونی کی بنا پر عطا ہوا۔ اس ارشادِ ربانی کے مطابق علمی فضیلت کے ساتھ جسمانی صحت و قوت بھی معاشرہ میں بلندی مقام کے لئے ضروری شرط ٹھہری، قرآن مجید میں مسلمانوں کو اُولُوا الْاَيْدِي وَالْاَبْصَار یعنی صاحبانِ قوت و نظر کہہ کر متعارف کرایا گیا ہے، روحانی اعمال کا مادی پہلو خوشگوار ہونا چاہئے اور مادی عمل میں روحانی جلا موجود ہونی چاہئے، حلّت و حرمت، جائز و ناجائز، مستحسن و مکروہ کی وضاحت سے اسلام، مادہ اور روح کی یکساں تربیت کا سامان مہیا کرتا ہے، اسلام کے نزدیک روحانی عمل، رہبانیت پر منتج نہیں ہوتا اور مادی عمل حیوانی افعال کو جنم نہیں دیتا، روح مادہ میں نامقبول مناسبت اور ناپسندیدہ تصادم ہی قوموں کی پستی و ذلت کا پیمانہ ہوتا ہے، عصرِ حاضر کے مختلف نظام ہائے تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ ان میں اکثر دو انتہاؤں کا شکار ہیں، کہیں روحانیت اور صرف روحانیت مدارِ تعلیم ہے اور جسم گھٹ کر رہ گیا ہے اور کہیں جسم کی نشو و نما اور آسودگی ہی مرکزِ تعلیم ہے اور روح سکڑ کر دم توڑ رہی ہے، اسلام نے اپنے دلکش توازن سے ایک کی قوت کو دوسرے کی تقویت کا موجب بنایا ہے۔

اسلام کے اختیار کردہ نظام تعلیم میں ہر شعبہ حیات کو مناسب نمائندگی دی گئی ہے، طب، ہندسہ، ریاضی، شماریات، تجارت، صنعت، سائنس، آرٹ، فلسفہ حکمت، زراعت، مرغ بانی اور ان کے علاوہ کئی دوسرے پیشہ وارانہ علوم وفنون اپنے اپنے دائرہ کار میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں پڑھائے جاتے رہے ہیں، یہ علوم وفنون کا تنوع تھا جن کا رخ ایک ہی تھا، قومی ضرورتوں، عصری تقاضوں اور پیش آمدہ حالات کی اساس پر ترجیحات متعین ہوتی رہی ہیں، کہیں بے رخی۔ شیرہ چشمی اور بے خبری کا مظاہرہ نہیں ہوا، یہ ضرور خیال رکھا گیا کہ پیشہ وارانہ تعلیم اور تربیت اپنے اپنے دائرہ کار میں رہے اور ہر شعبہ حیات کو مناسب توجہ ملے، ایک ڈاکٹر کو اپنے شعبہ میں مہارت کے لئے جو نصاب دیا گیا وہ اس نصاب سے مختلف تھا جو ایک ماہر معاشیات کے لئے مقرر تھا، یہ پیشہ وارانہ تقسیم تھی مگر بحیثیت انسان سب ایک ضابطے کے پابند اور ایک نصاب کی تعلیم کے ذمہ دار تھے، یہ کبھی نظر انداز نہ ہوا کہ انجینئر ہو یا ڈاکٹر، استاد ہو یا معاشی محقق، اجر ہو یا اجیر، یہ سب اپنے اپنے دائرہ کار میں مصروف رہیں گے مگر ان سب کا اشتراک انسان ہونے میں ہے اور اسلام کے نزدیک بطور انسان زندہ رہنے کے لئے بھی ایک نصاب ہے جو قرآن سنت کی اساس پر قائم ہے اس لئے علامہ اقبالؒ نے کہا

نوع انسان را پیام آخریں
حامل او رحمت للعالمین

یاد رہے کہ لائق اعتماد ماہر فن کے باوجود اچھے انسان کی ضرورت ہر دور کو رہے گی۔

معلم یعنی استاد ہر نظام تعلیم کو حجر اساسی ہے کہ اس کے بغیر کوئی نظام تعلیم اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا معلم صرف چند علوم کا ماہر یا کسی شعبہ علم کا محقق ہی نہیں ہوتا وہ طلبہ کے لئے راہبر و راہنما بھی ہوتا ہے، اس کا علم بھی اثر آفرین ہے اور اس کی ذات بھی، اسے منصب رسالت کے فرائض چہارگانہ کا وارث ہونے کا شرف حاصل ہے، اسے قراءت و تعلیم کے ساتھ تزکیہ نفوس کا فریضہ بھی انجام دینا ہے اس لئے اس کی علمی مہارت کے ساتھ کردار و اخلاق کی خوشنمائی بھی ضروری ہے، فنی ماہرین کی قدر و قیمت ہمیشہ مسلم رہی ہے مگر ماہرین فن کے لئے معاشرتی رہائشی لحاظ سے باکردار ہونا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اسلام بااخلاق علماء اور اخلاق باختہ ماہرین میں امتیاز کا قائل ہے، غلط بین اور غلط کار ماہرین معاشروں کے لئے مفید نہیں ہوتے بلکہ ان کی مہارت بسا اوقات معاشرتی الجھنوں کو جنم دیتی ہے، اس لئے کوئی قوم بھی اپنے مستقبل کو ناقابل اعتماد انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتی کہ ان کے علم و دانش سے کسی بھلائی کی امید نہیں کی جا سکتی، علامہ اقبالؒ نے تو اس معاملے میں شدت پسندانہ رویہ اپنایا تھا، فرماتے ہیں

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے
زبینائے غلط بینے نکوتر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش
ز دانشمندے بے دینے نکوتر

غور کیجئے آج کی سسکتی ہوئی انسانیت کی ضرورت کیا ہے! بدکردار ماہرین یا باکردار انسان، آج انسان اس لئے زبوں حال نہیں کہ سائنسی میدان میں اس کی رسائی ناقص

ہے بلکہ اس کے درد کا اصل سبب انسانیت کا فقدان ہے، اسلام ماہرین کو بنظر استحسان دیکھتا ہے مگر وہ انسانیت کی فلاح اور نوع بشر کے مستقبل کو بے یقینی کے دلدل میں اترنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے اسلامی نظام تعلیم میں معلّم کا منصب سب سے نازک اور بے پناہ ذمہ داریوں کا حامل ہے کہ اسے انسانی معاشرہ کی تعمیر کرنا ہے کہ ایسے باضمیر و باوقار محسنوں کے احسانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

متعلم یعنی طالب علم، نظام تعلیم کا وہ مرکزی کردار ہے جس کے گرد اور جس کی خاطر تعلیمی سرگرمیاں روبہ عمل لائی جاتی ہیں، طالب علم قوم کا مستقبل ہے اس لئے نظام تعلیم کا مرکز و محور ہے، طالب علم بچہ بھی ہوسکتا ہے، اور بچی بھی، اس لئے کہ معاشرتی حسن دونوں کے صالح تعلیمی رویے سے ہی برقرار رہ سکتا ہے، یہ ضرور ہے کہ اپنی معاشرتی حدود کے حوالے سے نصاب کی یکسانی کے باوجود، دونوں کے تعلیمی نہج میں قدرے تفاوت ہوگا، جیسے ایک ڈاکٹر کے لئے میڈیکل کے نصاب کی تعلیم اس کے پیشہ کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے جبکہ ایک انجینئر کے نصاب کے مشتملات اور حدود اس کی فنی ضرورتوں کے مطابق طے کی جاتی ہیں، اسی طرح عورت کی تعلیم میں پیشہ وارانہ مہارت کے عمومی رخ کے باوجود اسے ایک کامیاب ماں یا باوقار رفیقہ حیات بننے کے لئے چند مخصوص نصابی حوالوں کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، یہ بھی ضروری ہے کہ نظام تعلیم کے ہر شعبے میں صرف اور صرف استحقاق پیش نظر رہے، کسی گروہ یا طبقہ کو برتری حاصل نہ رہے، اس لئے اسلامی تعلیمات میں مراعات یافتہ طبقات کا کوئی تصور نہیں، بارگاہ علم میں بھی بلا تخصیص رنگ و نسل سب کو حاضر ہونے کا حق حاصل ہے اسلامی معاشرہ میں کسی کے کان میں اس لئے سیسہ نہیں ڈالا جاسکتا کہ وہ

کسی مقدس یا معتبر کتاب کے کلمات سننے کی جسارت کر چکا ہے اگر چہ بلا ارادہ ہو، یہاں صرف نیت حوصلہ اور ارادہ شرط ہے اسلام نے علم کو وقت کی تنگ نائے میں اسیر نہیں کیا بلکہ پالنے سے لحد تک طلب علم کے عرصہ کو دراز کر دیا اس طرح پوری زندگی کا مسئلہ بنا دیا، جغرافیائی حد بندیاں توڑیں، قومی و گروہی تفاخر کے بت پاش پاش کیئے اور علم جنس فروخت یا متاع خرید بنانا ممنوع قرار دے دیا اس طرح علم کے دربار میں سب کو یکساں مقام ملا۔

اسلامی نظام تعلیم کے عملی نفاذ میں حائل موجود یا وقتی رکاوٹوں کو کس طرح دور کیا گیا یہ بھی لائق استناد حوالہ ہے تعلیمی ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے وسائل درکار ہوتے ہیں، ان وسائل کی فراہمی کے لئے ہر فرد ملت پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ اس عمل خیر کا معاون بنے کہ یہ ایک بنیادی انسانی فریضہ ہے، یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ وسائل کی عدم دستیابی کسی صورت تعلیمی پیش رفت کو روکنے کا باعث نہ بنے، موجود وسائل خواہ کس قدر کم تر ہوں ان سے بہتر نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، غزوہ بدر کے مکی اسیران میں چند تعلیم یافتہ تھے ان سے تعلیم امت کا کام لے لیا گیا، کامرانی کے نشے میں حکمران محبوس افراد پر ظلم توڑا کرتے ہیں اور کبھی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان اسیروں کو تہہ تیغ بھی کر دیا جاتا ہے مگر ایسے ہیجانی حالات میں بھی نبی العلم ﷺ نے تعلیم کا اعلیٰ مقصد پیش نظر رکھا، یہ اسوہ حسنہ آنے والی نسلوں کے لئے راہ ہدایت تھا کہ وسائل کی کمیابی کے ماتم کی بجائے موجود وسائل سے بہتر کام لیا جائے۔

مختصر یہ کہ اسلامی نظام تعلیم میں علم کی فرضیت، تعلیم کے وجوب، علوم وفنون کے تنوع، حصول علم کی آزادی، معلم کی منزلت، طالب علم کی مرکزیت، افراد علم کی

عمومیت، تحدید علم کی نفی کے ساتھ تلاش علم کو بہر طور مناسب اور جائز مقام دیا گیا اور اس ساری تگ و دو میں شرف انسانیت کے تحفظ اور مقصد تخلیق کے ہدف کو مرکزی مقام حاصل رہا، یہ اسلامی نظام تعلیم کے چند نمایاں اور امتیازی خدوخال ہیں جن کی روشنی میں ہمیں اپنے وطن عزیز کے لیے ایسا نظام تعلیم وضع کرنا اور نافذ کرنا ہے جو ملی تشخص سے ہم آہنگ اور قومی امنگوں کے مطابق ہو، اس تشکیل جدید کے لئے چند تجاویز جو عملی اقدامات میں معاون ہو سکتی ہیں۔ پیش کی جا رہی ہیں یہ کوئی حتمی فارمولا نہیں، ارباب دانش اپنے غور و فکر میں ان کو بھی اہمیت دیں تو امید ہے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔

تجاویز کی عمومی نوعیت کے حوالے سے چند گزارشات:

(۱) علم کے حصول کی فرضیت کا اعلان کیا جائے تاکہ بے علمی کا کوئی جواز باقی نہ رہے۔

(۲) ترویج علم اور خواندگی کی شرح کا گراف بلند کرنے کے لئے علم کے حصول کی فرضیت کے ساتھ ایصال علم یعنی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا جائے، اس سلسلے میں سکول، کالج یا جامعات کا ہی مکلّف نہ بنایا جائے بلکہ ہر ادارے اور شعبے کو پابند کیا جائے کہ ان سے متعلق ہر وہ شخص جس کو علم حاصل کرنے کی سعادت مل چکی ہے وہ اس امانت کو دوسروں تک منتقل کرے تاکہ پوری قوم ناخواندگی کے عذاب سے رہائی پائے، حالات کی نامساعدت کی بنا پر کچھ ترغیبی انداز بھی اپنائے جائیں جن میں بہتر اور برتر ترقی کے امکانات بھی شامل ہوں تاکہ یہ مادی مہمیز قومی ضرورت کے لئے بہتر پیش رفت کا باعث بن سکے۔

(۳) نصاب تعلیم کو ملی تقاضوں کے حوالے سے ترتیب دیا جائے، ہر شعبہ علم کا نصاب مرتب کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ یہ نصاب ایک مسلمان اور پاکستانی طالب علم کے لئے ہے، نصابی کتب، دین کی محبت اور پاکستان سے وفاداری کی آئینہ دار ہوں، ابتدائی جماعتوں سے اس پر خصوصی توجہ درکار ہے، ناپختہ ذہنوں پر کوئی ناموافق ردعمل پیدا نہیں ہونا چاہئے تا کہ افتراق وانتشار کی کوئی صورت خواہ کسی قدر مخفی ہو تدریس کا حصہ نہ بنے۔

(۴) مندرجات نصاب کی تدوین میں اسلامی تعلیمات کی مبادیات کو یوں سمویا جائے کہ طالب علم ان کی حقانیت کا صدق دل سے معترف ہو جائے۔ پاکستان اور تحریک پاکستان، تاریخی پس منظر اور اس منزل تک کامیاب پیش قدمی کے تمام مضمرات واضح کئے جائیں، ان شخصیات سے متعارف کرایا جائے جو اس مشن میں ہمہ تن شامل رہی ہیں، بدقسمتی سے ہم شخصیات کے چناؤ میں ذہنی پراگندگی کا شکار ہیں اور ان شخصیات کے پراپگنڈے سے متاثر ہیں جو شریک سفر نہ ہونے کے باوجود تلاش منزل کا سارا کریڈٹ لینا چاہتی ہیں اس سے نوخیز طلبہ کے ذہن پاکستان کے حصول کی جدوجہد کے مقاصد کو سمجھنے میں الجھن محسوس کرتے ہیں ہمیں بڑے چھوٹے کی بحث سے ہٹ کر اپنوں کا ذکر کرنا چاہئے، مخالف خواہ کتنا عظیم ہو یا کتنا بڑا عالم ہو ہمیں تو تحریک پاکستان کے راہنماؤں اور کارکنوں کو سلام کرنا ہے وگرنہ بڑے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔

(۵) تدوین نصاب کے عمل میں ماہر اساتذہ اور قومی درد کے حامل معلمین کو شریک کیا جائے، غیر حاضر اساتذہ کے بجائے عملاً شریک اصحاب کو دعوت دی جائے کیونکہ وہ طالب علم کی نفسیات سے آگاہ بھی ہوں گے اور تدریس کی ضروریات سے باخبر بھی ہوں گے، اس سے دوراز کار منصوبوں کی تشکیل کا دیرینہ مرض بھی دور ہوگا اور قابل عمل تجاویز بھی سامنے آئیں گی۔

(٦) اساتذہ کی تربیت، تدریسی حسن کا لازمی جزو ہے کہ ان کی بہتر صلاحیت سے ہی قومی ارتقاء کے راستے کھلیں گے۔ تربیت کا بنیادی عنصر، اخلاق و کردار کی پختگی اور سیرت واعمال کی پاکیزگی ہے، اساتذہ کی معاشی کفالت بھی بھرپور توجہ کا مسئلہ ہے غیر مطمئن اور معاشی اضطراب کا اسیر ذہن، کبھی بھی اچھے نتائج پیدا نہیں کرسکتا ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ استاد کا منصب سب سے زیادہ حساس ہے اس لئے فوری توجہ کا مستحق ہے۔

(۷) تعلیم کا نظام، عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے، سائنسی علوم اور جدید ٹیکنالوجی کے حصول کے بغیر کسی بہتری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، صدیوں کا تنزل اس کا شاہد ہے کہ موجود علوم سے آنکھیں بند کرلینا وہی نتائج پیدا کرتا ہے جس سے ملت اسلامیہ آج کل دوچار ہے، اقتدار کے باوجود ہم نے انسانی فلاح کے کاموں سے صرف نظر کیا، سوچئے کیا مادی ترقی کی کوئی ممانعت تھی؟ کیا ہمارا ذہن ہمیں دنیا کی حسنات کے لئے دعائیں مانگنے کی تلقین نہ کرتا تھا؟ بدقسمتی سے ہم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے کو ہی سب کچھ سمجھا اور یہ محسوس نہ کیا کہ دعا تو عمل کی تحریک ہوتی

ہے، خالق سے جو مانگو اس کے لئے عملی اقدام بھی کرو، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دولت اور افراد کی کثرت کے باوجود ہم بے توفیق ہو گئے کیا بو علی سینا، ازھراوی، الغزالی اور الرازی کے حالات پڑھ کر فخر کرتے رہنے سے کچھ حاصل ہوگا؟ کیا ان جیسا بننا ممنوع ہو گیا ہے، حالات کی ستم ظریفی کا شکوہ کرتے رہنے سے کچھ نہ ملے گا حالات کی طنابیں تھامنا ہوں گا، حضرت علاّمہ تو کب کے کہہ گئے

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

اس کوتاہی کے ازالہ کے لئے ہمیں اپنی ترجیحات کو از سر نو ترتیب دینا ہوگا۔

(۸) تعلیم کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ملکی وسائل کو بروئے کار لانا ہوگا، کوشش کی جائے کہ عوام سے خواص تک سب اس نیک کام میں شریک ہو جائیں، علمی سر بلندی اور فنی مہارت متقاضی ہے کہ ہونہار اور ذہین طلبہ کی کفالت کی جائے تا کہ یہ افرادی قوت کا سرمایہ کسی احتیاج کی وجہ سے بے توفیقی کی نذر نہ ہو جائے طلبہ کی ضروریات، لائق استناد کتب کی موجودگی مدارس کی تعمیر و توسیع، اساتذہ کی تربیت و تعیناتی تعلیمی ماحول کی آسودگی او ر دیگر متعلقہ امور پر اٹھنے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ملت کے ہر فرد کو شریک جہاد ہونا چاہئے، حکومت کی غیر ضروری مدوں کو تعلیمی سہولت کے لئے وقف کر دینا چاہئے، غیر حکومتی اداروں کو بلکہ ہر صاحب حیثیت کو اس طرف توجہ دینا چاہئے، یقین ہے کہ اگر مقصود کی عظمت اور افادیت

واضح کر دی جائے تو ہر درد مند انسان تعاون کے لئے بے تاب ہوگا، استقبالی جھنڈیوں اور خود نمائی کے بینرز پر بے دریغ خرچ کرنے والے، راستوں کو لمحاتی آسودگی یا انانیت کے طمطراق کی خواہش پر دولت ضائع کرنے والوں کو سیدھا راستہ دکھایا جائے تو ہوسکتا ہے نمود و نمائش کے فریب میں غلطاں اذھان کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں، اس کے لئے بھرپور تحریک، مسلسل توجہ اور سب سے بڑھ کر حکومتی رویے میں موافق تبدیلی درکار ہے۔ اللہ کرے یہ ملت، علمی افلاس کی قہر سامانی کا ادراک کرے اور اس کے ازالہ کے لئے ہمہ تن مصروف عمل ہو جائے آمین۔

دینی مدارس

اسلام دین ہے کہ انسانی زندگی کے ہر رخ کو محیط ہے، علم جو انسانی وجود کی شناخت اور اس کے شرف کا جوہر ہے دین کے فکری و عملی کردار کی اساس قرار پایا، ''اقراء'' کے مطالبے سے شروع ہونے والا پیغام علم کی بالا دستی کا پیغام بنا، نطق سے لے کر تطہیر باطن تک اور تطہیر باطن سے آفاق کی پنہائیوں کے ادراک تک علم کی سطوت قائم ہوئی، اصحاب صفہ، متلاشیان علم کے راہبر بنے، یہ اقامتی طلبہ علم کی نورانیت کے سایوں میں علیم و خبیر نبی ﷺ کے تلمذ سے فیض یاب ہوئے اور پھر یہ سلسلہ ریاست کے طول و عرض کو محیط ہو گیا، فرضیت علم وجوب تعلیم اور منزلت متعلمین نے قلوب و اذھان کو مسخر کر لیا اور قریہ قریہ، بستی بستی علم کدے آباد ہو گئے، حکومت کی حدود کے پھیلاؤ سے مراکز علم میں اضافہ ہوتا گیا، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے بعد کوفہ،

بصرہ، بغداد، قاھرہ، قرطبہ، غرناطہ کے مراکز قائم ہوئے، طلبہ، اساتذہ سے کسب فیض کے لئے شہر شہر گھومتے رہے، اساتذہ نے ان طلبہ کے لئے گھر کے دروازے ہی نہیں، دل کے دروازے بھی کھول دیئے، یہ تب وتاب رنگ لائی اور مسلم معاشرہ اشاعت علم کا معتبر حوالہ بنا، معاشرت جب ٹھہراؤ کی لذت پا لیتی ہے تو تہذیبی تقاضے علمی مراکز کے قیام کا باعث بنتے ہیں، مدارس کی ابتداء، نصاب سازی کی تدوینی کیفیات کا آغاز، اساتذہ کی تربیت وفراہمی اور ماحول کی استواری کا قیام، مستحکم حکومتوں کی وجہ سے آسان ہو جاتا ہے، اموی دور میں تدریسی ادارے جنم لے چکے تھے عباسی دور میں ان مدارس کی منزلتوں میں مزید اضافہ ہوا، اندلس کی سرزمین اس سلسلے میں بڑی زرخیز ثابت ہوئی، علمی پیش رفت نے ساری دنیا کو متوجہ کیا، تحقیقی ہماہمی نے عظمتوں کے کئی در وا کئے، علم کے پھیلاؤ کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کے لئے قلم کا کردار نمایاں ہوا کہ علم کو قلم سے محفوظ کرنے کا درس دیا گیا تھا، بغداد کا ”جامعہ نظامیہ“، علمی جستجوؤں کا حاصل ٹھہرا، جنسیات کے تفاوت اور تعبیر کے اختلاف کے باوجود پوری معلوم دنیا دربار علم میں ایک ساتھ حاضر ہوگئی، علمی مراکز کا جال بچھا اور تحقیق وجستجو کا حق ادا ہوا۔

محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ اسلامی تہذیب کا رابطہ برصغیر کی ملفوف ویدانت سے ہوا، مقابلہ سخت تھا کہ صدیوں کا تعامل مددگار تھا مگر مسلمانوں کی علمی برتری نے یہ مشکل بھی آسان کردی۔ مقامی افراد کو قریب تر لانے کے لئے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا تا کہ حقائق، زبان کی غیریت میں اوجھل نہ رہ جائیں، سلاطین کے دور سے ہی علمی مراکز اور تربیتی زاویے قائم ہونے لگے، ان مراکز سے ایسے

افراد نکلے جو عقائد میں پختہ، اعمال میں مستقیم اور کاروبار حیات کی پیش رفت کے اہل تھے۔ تعلیم مادہ اور معاد دونوں پہلوؤں کو محیط تھی۔ یہ سلسلہ مغلیہ دور زوال تک جاری رہا مگر جب انحطاط گھمبیر ہوتا محسوس ہوا تو اہل درد کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ماضی کا درخشندہ اثاثہ اغیار کی نذر نہ ہو جائے اس لئے تحفظ ما سلف کے لئے ایک مربوط نظام تشکیل دیا گیا، غلامی جسد ملت کو اپنے زہر آلود پنجوں میں جکڑ رہی تھی اس لئے دین اور اسلاف کی علمی ثروت کو مضبوط حصار میں لینے کی احتیاج ہوا، یہی احتیاج ''مدارس نظامیہ'' کے اجراء کی محرک بنی، ملا نظام الدین سہالوی کی اس کاوش کو انہیں کے نام سے شہرت ملی۔ ان مدارس کا نصاب ترتیب دیا گیا جو ضروری گیارہ علوم وفنون پر مشتمل تھا، ان میں علم صرف علم نحو، علم منطق، علم حکمت وفلسفہ، علم ھیت و ہندسہ، علم بلاغت، علم فقہ، علم اصول فقہ، علم کلام، علم تفسیر اور علم حدیث شامل تھے، بنیادی طور پر یہ تحفظ دین وشریعت کا اہتمام تھا مگر مولفین کی بالغ نظری نے ان میں زبان کے علوم، احکام کے علوم، فلسفہ وحکمت کے علوم کے ساتھ منطق، ھیت و ہندسہ کو بھی شامل کیا تا کہ طلبہ میں ظاہری اور ضروری مادی علوم سے آشنائی بھی قائم رہے ضرورت وقت کے تحت نصابی کتب کی تحدید بھی کر دی گئی جیسے ہر نصابی ادارہ کرتا ہے، یہ بھی ہوا کہ حالات کے تناظر میں نصابی کتب میں تبدیلی بھی آئی، خوب تر کی تلاش کا احساس رہا مگر عمومی ڈھانچہ برقرار رہا۔

انگریزی استعماریت کے دور میں نظام تعلیم پر انگریز کی بالادستی قائم ہوگئی حتی کہ ذرائع روزگار کا تمام سلسلہ سرکاری تعلیمی اداروں کے ہاتھ رہا اس سے دینی مدارس بہت بڑے اضمحلال کا شکار ہوئے، معاشی حالت مسلم قوم کے حوالے سے نہایت گھبیر

تھی احتیاج کی ہر صورت دینی مدارس کو محصور کرتی جا رہی تھی مگر باہمت افراد نے اس معاشی گھٹن میں بھی زندہ رہنے اور مقصد تعلیم کو فروغ دینے میں بڑا فعال کردار انجام دیا، ان حالات میں تدریسی نصاب میں کسی ردو بدل یا اضافہ کا عمل نہ ہو سکا کہ اب تحفظ ذات کا مرحلہ درپیش تھا، دور غلامی اسی تگ ودو میں گزرا۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی یہ لازم تھا کہ غلامی کے سایوں کو ہٹایا جاتا اور ان مدارس کو ماضی کی عمدہ کارکردگی کی بنیاد پر قومی دھارے میں نمایاں مقام دیا جاتا، ملت اسلامیہ کو مدارس کے حوالے سے یہ نمایاں پہلو راہ نما بنانے چاہیں تھے کہ یہ مدارس:

- وطن عزیز کے قیام سے قبل معاند حالات میں بھی امت مسلمہ میں اشاعت تعلیم کا موجب رہے ہیں۔
- ان طلبہ وطالبات کی کفالت کر رہے ہیں جو تعلیم کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، یہ حقیقت ہے کہ اس تعلیم کا سارا اہتمام وانصرام مدارس ہی کی طرف سے ہوتا ہے، رہائش، خوراک کتب حتی کہ لباس اور صفائی کے اخراجات بھی مدارس ہی برداشت کرتے ہیں، یہ خالص قومی تحریک اور ملی جدوجہد کے ادارے ہیں۔
- اُس لحاظ سے گھٹن کا شکار رہتے ہیں کہ جاری اخراجات میں اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست میں بھی یہ بے سہارا رہے ہیں۔
- جن طلبہ کو زیور علم سے مزین کرتے ہیں ان کی ملازمتوں کی ذمہ داری بھی کسی حکومت نے نہیں اٹھائی۔
- خود کفالت کے نظام کے تحت چلتے رہے اور زیادہ تر زکوۃ وصدقات کا سہارا

لیتے رہے۔ زکوٰۃ جب سے حکومتی گرفت میں آئی، مدارس کا یہ ذریعہ معاش بھی کمزور پڑ گیا، بعض اداروں کو زکوٰۃ فنڈ سے کچھ دیا بھی گیا مگر اس عمل میں کئی پیچیدگیاں بلکہ ناہمواریاں حائل رہیں۔

ان حالات میں مدارس جدید علوم کو اپنے نصاب میں نمایاں مقام نہ دے سکے، اگر قیام پاکستان کے ساتھ باہمی مشاورت اور اور ملی مقاصد کے حصول کی اہمیت کا اہتمام کر لیا جاتا تو حالات اس قدر موضوع بحث نہ بنتے، اب بھی اگر صاف دلی اور پاکیزہ نفسی کے ساتھ وطن عزیز کے تشخص کے حوالے سے کوئی لائحہ عمل طے کر لیا جائے تو اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ مقاصد کی یگانگت ہو، معاندت کی فضا ختم ہو یقین کیجئے اگر دینی مدارس تدریسی عمل میں فعال کردار انجام دینے لگیں اور انہیں بلا وجہ ہدف تنقید نہ بنایا جائے تو پاکستان میں علمی انقلاب آ سکتا ہے اور فضاؤں میں تقدیس اتر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں چند ابتدائی تجاویز:

(۱) دینی مدارس اور عمومی تدریسی اداروں میں اشتراک عمل ہونا چاہئے بد قسمتی سے ہر فریق دوسرے فریق پر بعض جائز اور بعض ناجائز اعتراضات قائم کر کے تضحیک کا نشانہ بن رہا ہے اس صورت حال کا ازالہ ضروری ہے ان اداروں کی باہمی مناقشت دور غلامی کی یادگار ہے کہ ہر دو اداروں کے مقاصد مختلف تھے اب آزادی کی فضا میں اور وطن عزیز کے اسلامی تشخص کی موجودگی میں یہ باہمی نزاع مناسب نہیں، اسلامی ریاست کا قیام تقاضا کرتا ہے کہ سیکنڈری سکول سرٹیفکیٹ کی سطح پر نصاب کے حوالے سے دینی تعلیم کا ایک گروپ تشکیل دیا جائے جو دیگر گروپوں کے ساتھ چند لازمی

مضامین میں اشتراک کرے اور چند مضامین کا علیحدہ گروپ بنے جیسے
سائنس اور آرٹس کے گروپ ہیں، اگر کوئی دینی ادارہ اس سطح کی تعلیم کو اپنے
ادارہ میں نافذ کرنا چاہیے تو بھی ایسا کر سکے، اس سے یگانگت کی فضا پیدا ہو
گی اور باہمی وبعد ختم ہوگا، اس سطح کا امتحان تعلیمی بورڈ لے، یہ سلسلہ
انٹرمیڈیٹ تک اسی اشتراک کے ساتھ چلے علیحدہ گروپ کی تشکیل کے
باوجود مشترک لازمی مضامین کا اجتماع، اتفاق واتحاد کی صورت گری کرے
گا اور محبت باہمی کا ظہور ہوگا، لازمی مضامین پڑھنے سے دینی تعلیم کے لئے
اپنے آپ کو وقف کرنے والے طلبہ میں ایک علمی وسعت پیدا ہوگی اور وہ
بعض سائنسی یا بنیادی معلومات پر مشتمل مضامین سے آشنا ہونے کی بنیاد پر
زیادہ اعتماد پیدا کر سکیں گے، دینی تعلیم کے حوالے سے اسلامیات کا لازمی
پرچہ عمومی طلبہ کو بھی دین سے قرب عطا کرے گا، ضروری یہ ہے کہ تدوین
نصاب کو قومی ضرورت سمجھتے ہوئے پوری لگن سے کام لیا جائے۔

(۲) اساسی لازمی تعلیم کے بعد دینی مدارس کو میڈیکل انجینئرنگ یا کامرس کے
اداروں۔ کالجوں/ یونیورسٹیوں کی طرح دینی مدارس کے تخصص کے ادارے
بنایا جائے اور دیگر مخصوص اداروں کی طرح ان کی رجسٹریشن بھی ہو اور
یونیورسٹیوں سے ان کا الحاق بھی ہوتا کہ امتحان کا طریقہ کار قابل اعتماد ہو
جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے لئے ایک یا زیادہ یونیورسٹیاں قائم کر دی
جائیں جو ان دینی مدارس کے طلبہ کا امتحان لیں اور انہیں نصاب کی سطح کے
تعین کے حوالے سے گریجویشن یا ایم۔ اے کی ڈگریاں جاری کریں اور یہ

بھی کہ ان یونیورسٹیوں میں ایم۔اے کے بعد تحقیقی پیش رفت کی بھی گنجائش ہوتا کہ ان مدارس کے طلبہ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے عصر حاضر کے مسائل پر تحقیقی کاوش سامنے لاسکیں، اس میں ان طلبہ کا افق بھی وسیع ہوگا کہ ملت کو ہر پیش آمد مسئلہ کے حل کی سہولت بھی ملے گی، اس عمل سے اسلامی ریاست میں مقاصد کی وحدت اور نظریات کی یگانگت پیدا ہوگی۔

(۳) دینی مدارس اور عام تعلیمی اداروں میں موجود عدم مشارکت کا ایک اہم سبب معاشرتی مرتبہ و مقام بھی ہے، مدارس میں بیشتر ایسے طلبہ داخل ہوتے ہیں جو معاشی جبر یا معاشرتی ناہمواری کے باعث ان رفاہی اداروں کی پناہ لیتے ہیں، ان طلبہ کی گھریلو مجبوریاں ان کے لئے مسلسل ذہنی کوفت کا باعث بنتی ہیں اس لئے وہ زرخیز اور توانا ذہن رکھنے کے باوجود اعلیٰ درجہ کی کارکردگی نہیں دکھا سکتے، اس محرومی کا ازالہ ہونا چاہئے، تعلیم خواہ سرکاری اداروں میں ہو یا دینی مدارس میں قوم کو اس کا بوجھ برداشت کرنا ہے کہ تعلیم ایک فریضہ ہے کاروبار نہیں۔

(۴) تعلیمی عمل میں مساوات کا رویہ قومی ضرورت ہے، علم مقدس ہے تو اس کی تقدیس بحال ہونی چاہئے، مراعات یافتہ طبقات کی حس تفاخر کو زندہ رکھنے کے لئے الگ تعلیمی ادارے قومی یک جہتی کا وہ ناسور ہے جو اونچ نیچ کے تصور کو جنم دے رہا ہے، نوخیز اذھان جب ان اداروں میں تربیت پاتے ہیں تو ان کے اندر ذاتی برتری کا عفریت ناچنے لگتا ہے جس سے ساری زندگی نجات نہیں ملتی، وحدت قومی اور اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ علم کی

بارگاہ میں سب کو یکساں مقام دیا جائے اور صرف صلاحیت کو اہمیت دی جائے، اس سے قومی دولت کا ضیاع اور وحدت ملی کا افتراق رک جائے گا، اس نہایت حساس مسئلہ پر اصحاب فکر کو فوری توجہ دینا چاہئے۔

ان تجاویز میں مکر و اضافہ کا امکان بہر حال باقی ہے، یہ صرف اساسی مشورے ہیں تا کہ کام کا آغاز کیا جا سکے، مجھے یقین ہے کہ رب قدیر اس ریاست کو اپنی رحمتوں سے نوازے گا کہ اس کا وجود اس سے پیمان وفا باندھنے کے لئے قائم ہوا تھا، حکیم و علیم خالق اپنے حبیب مکرم ﷺ کی امت کو راستی کی ہدایت فرمائے اور اخلاف کو اسلاف کی وراثت علم کا اہل بنائے آمین

اللھم صَلِ وَسلّم دائمًا ابدًا..........علیٰ حبیبک خیرِ الخلق کلھم

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

مکتبہ جمالِ کرم کی چند یادگار تصانیف







